یادِ رفتگاں

عبدالشکور ظہیر☆

حضرت مولانا شیخ الحدیث محمد عبداللہؒ

[شخصیت، علمی و جماعتی خدمات، چند ایمان افروز واقعات اور سفر آخرت]

شاہراہِ زندگی کی منازل طے کرنے کے بعد موت کے پل کو عبور کرکے دارِ عقبیٰ میں قدم رکھنا ہر ذی روح کے لئے اللہ تعالیٰ کا مقررہ کردہ اٹل قانون ہے جس کے تحت لاکھوں انسان دارِفانی میں آنکھ کھولتے اور ہزاروں لوگ، کچھ اس انداز سے رختِ سفر باندھتے ہیں کہ کسی کو خبر تک نہیں ہوتی۔ مگر کچھ لوگ اپنے سیرت و کردار، حسن اخلاق اور علمی کارناموں کی حسین یادیں کتابِ زمانہ کے اوراق میں بکھیر جاتے ہیں جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کبھی بھی محو نہیں ہو پاتیں۔ موت جتنی بڑی حقیقت ہے، اتنی ہی بری خبر بھی لیکن اس سے بڑھ کر یقین والی بات کوئی نہیں!!

اور یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ روزِ اول سے اب تک اور آج سے روزِ آخر تک اللہ تعالیٰ پیغام توحید، حضور اکرم ﷺ کے متبرک اسوۂ حسنہ، تعلیمات کی تبلیغ و ترویج اور انہیں ایک عہد سے دوسرے عہد تک منتقل کرنے کے لئے ایسی نابغہ روزگار شخصیات سے نوازتے رہے ہیں جن کی زندگی اعلیٰ و ارفع مقاصد، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی تبلیغ و اشاعت کے لئے وقف رہی ہے اور رہے گی۔ ان شخصیات نے اپنے اپنے وقت میں، حالات و واقعات کے مطابق، نہایت مشکل اور نامساعد حالات کے باوصف، ناقدریٔ زمانہ کے باوجود، حضور اکرم ﷺ کے پیغامِ دلنشین کو ایک نسل سے دوسری نسل تک پہنچانے میں جو بے نظیر خدمات سرانجام دی ہیں، وہ ہماری تاریخ کا قیمتی ورثہ ہے۔ انہی جیسی شخصیات میں سے ایک روشن ستارہ مولانا محمد عبداللہؒ ہیں، جو ۲۸/اپریل ۲۰۰۱ء بروز ہفتہ ۸۱ برس کی عمر میں ہمیں داغِ مفارقت دے گئے (انا للہ وانا الیہ راجعون)...... آیئے ان کے ایمان پرور روشن ابوابِ زندگی ملاحظہ کرتے ہیں

پیدائش، نام و نسب

حضرت مولانا کی پیدائش ۱۸/ مارچ ۱۹۲۰ء بمطابق ۲۶/جمادی الثانی ۱۳۳۸ھ بروز جمعرات، سرگودھا سے تقریباً ۲۵ کلومیٹر دور بھیرہ اور ملک وال کے تاریخی قصبات کے پاس تحصیل بھلوال کے نواحی گاؤں چک نمبر ۱۶ جنوبی میں ہوئی۔ آپ کے والد گرامی مولانا عبدالرحمٰن نے آپ کا نام محمد عبداللہ رکھا۔ بعدازاں آپ 'شیخ الحدیث' کے لقب کے ساتھ مشہور ہوئے۔ اکثر و بیشتر علماء وطلباء آپ کو شیخ الحدیث

☆ فاضل جامعہ لاہور الاسلامیہ ...... سیکرٹری اسلامک ہیومن رائٹس فورم

کے نام سے ہی یاد کیا کرتے تھے۔

درمیانہ قد، اُٹھا ہوا ورزشی جسم، سعادت کے نور سے روشن کشادہ پیشانی، درمیانی سفید داڑھی، سفیدی مائل گندمی رنگ، چوڑا چہرہ، ذہانت کی لو سے چمکتی ہوئی خوبصورت آنکھیں، گندمی ہونٹ، باوقار اور وجیہ شخصیت، پروقار چال ڈھال کے مالک مولانا محمد عبداللہ مرحوم تھے۔ مولانا محترم ایامِ شباب میں پہلوانی کرتے رہے ہیں، ورزش ان کا معمول ہوا کرتا تھا، خوراک کی طرف خصوصی توجہ دیتے تھے، اسی وجہ سے وہ مضبوط اور گٹھے ہوئے جسم کے مالک تھے۔ آخری ایام تک مضبوطی جسم کا یہی حال تھا۔ آپؒ حدیث نبویؐ: ''المؤمن القوي خير من المؤمن الضعيف'' کا مصداق تھے۔ بلند علمی مرتبہ کی وجہ سے عالمانہ شان اور وقار بھی رکھتے تھے۔

محترم مولانا عبدالرشید راشد، جامعہ لاہور الاسلامیہ کے استادِ گرامی بیان فرماتے ہیں:

> ''ہم چند ماہ قبل شیخ عبداللہ صالح العبید (ریاض، سعودیہ) کی معیت میں مولانا مرحوم سے بغرضِ زیارت ملنے کے لئے گئے۔ مولانا سخت علالت کی وجہ سے زبان کو حرکت تو نہ دے سکتے تھے، البتہ ہوش وحواس قائم تھے، جب میرے سے مصافحہ کیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ میں صاحبِ فراش سے نہیں بلکہ کسی مضبوط شخصیت سے مصافحہ کر رہا ہوں۔ مصافحہ اتنا جاندار تھا کہ محسوس ہوتا تھا کہ کسی سے ہاتھ ملایا جا رہا ہے، اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ جوانی میں پہلوانی کرتے رہے تھے۔''

تعلیم وتعلّم

مولانا موصوف نے ۱۹۳۳ء میں مقامی گورنمنٹ سکول سے مڈل کا امتحان پاس کیا، پھر دینی تعلیم کی طرف رغبت کی وجہ سے ۱۹۳۴ء میں مدرسہ محمدیہ، چوک اہلحدیث، گوجرانوالہ میں داخلہ لیا۔ اسی مدرسہ سے دینی تعلیم عرصہ آٹھ سال میں مکمل کر کے ۱۹۴۱ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔ دورانِ تعلیم سے ہی وہ خطابت میں دلچسپی رکھتے تھے اور گاہے بگاہے منبر خطابت پر اپنے جوہر دکھاتے رہتے تھے۔ لیکن ۱۹۴۲ء میں تعلیم سے فراغت کے بعد مستقلاً تدریس اور خطابت کا آغاز کیا۔ مدرسۂ محمدیہ چوک اہلحدیث میں تدریس کا آغاز کیا تو اس وقت یہاں حضرت حافظ محمد گوندلویؒ بھی کرسیٔ تدریس پر متمکن تھے۔ دوسری طرف جامع مسجد دال بازار، گوجرانوالہ میں انہوں نے درسِ قرآن اور خطابت کا سلسلہ شروع کر دیا جو حضرت مولانا اسماعیل سلفیؒ کی وفات (۱۹۶۸ء) تک جاری رہا۔ بعد ازاں گوجرانوالہ کی جماعت اہلحدیث نے انہیں مولانا اسماعیل سلفی کا جانشین مقرر کر دیا۔ آپ تقریباً دس سال تک مرکزی جمعیت اہلحدیث پاکستان کے امیر رہے۔ دال بازار کی جامع مسجد پر محکمہ اوقاف کے قبضہ کے بعد بوجوہ انہیں کوئٹہ جانا پڑا جہاں سے انہوں نے محکمہ اوقاف کی کوئٹہ اکیڈیمی سے فاضل کا امتحان پاس کیا۔ بعد ازاں منشی فاضل اور مولوی فاضل

کی سندات بھی حاصل کیں۔

اساتذہ کرام

مدرسۂ محمدیہ کے جن اساتذہ سے آپ نے اکتسابِ فیض کیا، ان میں سے سرفہرست اُستاذ الاساتذہ حضرت مولانا حافظ محمد گوندلویؒ ہیں۔ حضرت حافظ گوندلویؒ سے آپ نے مشکوۃ المصابیح، موطأ امام مالک، ہدایہ، شرح وقایہ، مسلم الثبوت، شرح جامی، اشارات، کافیہ اور صحیح بخاری پڑھیں۔

آپ کے دوسرے نامور استاد حضرت شیخ الحدیث مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ ہیں جن سے آپ نے جامع ترمذی، سنن نسائی، ابوداود اور صحیح مسلم کے علاوہ مختصر المعانی اور مطوّل وغیرہ کا علم حاصل کیا۔

ایک گراں قدر قربانی

مولانا موصوف جب کوئٹہ سے تکمیل نصاب کے بعد واپس گوجرانوالہ تشریف لائے تو اپنے تدریسی ذوق کے چڑھاؤ کی وجہ سے دال بازار میں جامعہ شرعیہ مدینۃ العلم کے نام سے ایک دینی مدرسہ قائم کیا جو کچھ عرصہ کے بعد ایک پرشکوہ عمارت کا حامل ادارہ بن گیا تھا۔ ۱۹۶۸ء کی بات ہے جب ان کے استادِ گرامی شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ دارِفانی سے کوچ فرماگئے تو احبابِ اہلحدیث کی طرف سے حضرت مولانا کو مولانا اسماعیل سلفیؒ کے منبر خطابت چوک نیائیں فروکش کیا گیا تو آپ نے اپنی مصروفیات اور احبابِ جماعت کی خواہش پر جامعہ شرعیہ مدینۃ العلم کو اپنی مادرِ علمی مدرسہ (جامعہ محمدیہ) میں ضم کردیا۔ چنانچہ جامعہ شرعیہ مدینۃ العلم کی پرشکوہ عظیم الشان عمارت پر جامعہ محمدیہ کا بورڈ آویزاں کردیا گیا۔ درحقیقت مولانا کا یہ گراں قدر ایثار وقربانی ہے جو انہوں نے اپنے مربی استاد اور اپنی عزیز مادرِ علمی کے لئے دی تھی۔ بنابریں جامعہ محمدیہ کے فیض میں حضرت موصوف کا بصورتِ صدقہ جاریہ بہت بڑا ہاتھ ہے۔

فنِ تدریس وخطابت

حضرت مولانا محمد عبداللہؒ جماعت اہلحدیث کی صفِ اول کے ایک نامور رہنما، کہنہ مشق مدرّس، ممتاز اور قدآور علمی شخصیت تھے۔ اللہ نے آپ کو ذہن رسا اور کمال استحضارِ علمی سے نوازا تھا، علمی دسترس کی وجہ سے آپ علمی مکالمہ میں خصوصی ملکہ رکھتے تھے۔ مولانا موصوف کو تدریس وخطابت کا فن اپنے اساتذہ خصوصاً مولانا اسماعیل سلفیؒ سے ملا تھا۔ آپ نے عرصہ ۳۱ سال تک اپنے استادِ گرامی کے جاری کردہ درسِ قرآن اور خطبہ جمعہ کو بالاہتمام نبھایا۔ منفرد اور اعلیٰ تدریسی مہارت کے ساتھ ساتھ آپ ایک بلند پایہ خطیب بھی تھے۔ بیان کرنے کا انداز عام فہم، پرمغز، مدلل، مؤثر اور دلنشین ہوتا تھا۔

تفسیر میں آپ کو ایسا ملکہ حاصل تھا جو کم ہی علما کے حصہ میں آیا ہے۔ بیان کرنے کا ایسا اسلوب

رکھتے تھے کہ جو بھی سنے گویا خود کو ان حالات و واقعات سے گزرتا محسوس کرے۔ مولانا کے درسِ خطابت میں بڑی خوبی جو بیان کی جاتی ہے وہ یہ کہ موضوع کے متعلقہ پہلوؤں میں سے کسی پہلو کو تشنہ نہ چھوڑتے تھے۔ کئی اشکالات جو موقع بہ موقع جنم لیتے تھے، ساتھ ساتھ حل ہوتے جاتے۔ چنانچہ مولانا سے کسی نقطہ کی وضاحت یا اعتراض کا جواب لینے کی گنجائش باقی نہ رہتی تھی۔ ہر درس و خطاب میں ان کی عالمانہ شان موجود ہوا کرتی تھی۔ بعض ایسے مسائل جن پر دیگر علمائے کرام کچھ بیان کرنے سے قاصر ہوتے، مولانا صاحب اپنے جواہر کی جولانی دکھاتے تو حلقہ درس میں ہر شخص ہمہ تن گوش ہو جاتا۔ شرعی احکام کی تفصیل، عذابِ قبر کا منظر، اور احوالِ قیامت کے تذکرہ میں دل کی تیز دھڑکنوں کے ساتھ ہر آنکھ آشکبار ہو جاتی۔ کسی بھی واقعہ کا منظر، پس منظر، پیش منظر اور تہہ منظر کچھ اس انداز اور ترتیب سے پیش فرماتے کہ پورے واقعہ کا نقشہ اثرات سمیت دل میں پیوست ہو جاتا۔ اور سامع اپنے دل کی کیفیت باوجود کوشش کے چھپا نہیں سکتا تھا۔ آپ کے محترم حافظ عبدالقدوس صاحب (گوجرانوالہ) کے بقول:

> ''ہم جامعہ محمدیہ نیائیں چوک میں حفظِ قرآن کرتے تھے کہ دیکھتے ہیں کہ ایک بزرگانہ وضع قطع کا جواں سال رات کے آخری حصہ میں بیدار ہو کر غسل کرتا ہے، پھر نمازِ تہجد کے لئے اللہ کے حضور ہاتھ باندھے کھڑے ہو کر مناجات ہوتی ہے، راز و نیاز کی نہ جانے کیا کیا باتیں ہوتی ہیں۔ تہجد سے فراغت کے بعد وہ مطالعہ میں مصروف ہو جاتا ہے، اتنے میں نمازِ فجر کا وقت ہو جاتا ہے، نماز فجر کے بعد وہ درس دینے کے لئے بیٹھ جاتے ہیں تو راز منکشف ہوتا کہ یہ حضرت مولانا محمد عبداللہ ہیں۔ پھر درس کیا ہوتا، ایک جادو ہوتا تھا۔ جس موضوع پر گفتگو کرتے جاتے، ہر ہر بات سامع کے دل میں اُترتی چلی جاتی۔ بات کرنے کا ڈھنگ اور سمجھانے کے ڈھب سے خوب واقف تھے۔ ہر روز ایک نئے موضوع پر درس ہوتا۔ ایسے ایسے موضوعات چھیڑتے پھر ان پر سیر حاصل بحث کرتے کہ دوبارہ، سہ بارہ سننے کو جی چاہتا مگر ایک لمبا عرصہ ان کے زیر سایہ گزارنے کے باوجود آج تک انہوں نے دوبارہ کسی سابقہ موضوع کو نہ چھیڑا۔ مولانا کی قوتِ بیانیہ اس قدر ٹھوس اور عام فہم ہوتی کہ اردو زبان میں فصیح و بلیغ تقریر کرنے کے مدعی حضرات کی تقریر میں وہ کیف اور لطف نہ ملتا جو مولانا کے خطاب سے حاصل ہوتا تھا۔''

مولانا کا خطبہ جمعہ بھی مولانا اسماعیل سلفیؒ کی طرح عوامی انداز میں بہترین خطبہ ہوا کرتا تھا، جس میں ملک میں پیش آمدہ مسائل، ان کا تجزیہ پھر ان کا حل کتاب وسنت کی روشنی میں اس قدر تفصیل سے دیا جاتا کہ کوئی پہلو تشنہ نہ رہ جاتا۔ بدعات اور کفر و شرک کے خلاف جہاد مولانا کے خطبات کی اصل روح ہوتے تھے۔ اگرچہ تقریر کی طرف میلان کم تھا مگر وہ خطبہ سے ہی تقریر کا کام نکال لیا کرتے تھے، ویسے بھی تدریسی مشاغل اور تعلیمی و خطابتی ذمہ داریاں اس قدر حاوی رہیں کہ جلسوں میں تقریریں کرنے کے مواقع

بہت کم میسر آئے۔ پھر بھی جب کبھی کانگریس کی مخالفت کا وقت آیا یا مسلم لیگ کی حمایت کی ضرورت پیش آئی تو آپ نے اپنے خطباتِ جلیلہ سے پاکستان کی خوب حمایت کی اور کانگرس کے نظریات پر سخت چوٹیں لگائیں، حتیٰ کہ آپ نے ان حضرات کا اپنے خطبات سے خوب محاکمہ کیا جو سیاست کو مذہب سے الگ چیز گردانتے تھے۔ درحقیقت آپ دین وسیاست کی تفریق اور دورنگی کے قائل نہیں تھے۔ آپ کا نظریہ مذہب وسیاست کے متعلق یہ تھا کہ مذہب اور سیاست ایک ہی جسم کے دو اعضاء یا ایک ہی درخت کی دو شاخیں ہیں۔ ان کو ایک دوسرے سے الگ کرنا گویا ایک جسم کو دو حصوں میں تقسیم کرنا ہے۔

مزید آپ نے تدریس وخطابات کے ساتھ ساتھ اِفتاء کی ذمہ داریاں بھی نبھائیں۔ باوجود علومِ شرعیہ پر عبور کے آپ نے مستقلاً مسندِ افتا تو نہیں جمائی مگر گاہے بگاہے اور بوقتِ ضرورت کافی حد تک فتویٰ نویسی کا کام سرانجام دیتے رہے۔ ان کے فتاویٰ کی تعداد ہزاروں سے متجاوز ہے۔ یہ فتاویٰ الگ مقام پر اکٹھے کر کے شائع کرنے کی ضرورت ہے۔

گوجرانوالہ شہر کی خوش قسمتی

تاریخی، ملی اور دینی اعتبار سے وزیر آباد اور گوجرانوالہ کو ایک اہمیت حاصل رہی ہے، چنانچہ جب حضرت مولانا استاذ الاساتذہ حافظ محمد محدث گوندلویؒ، حضرت مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ اور حضرت مولانا ابوالبرکاتؒ کی وفات کا عظیم سانحہ درسانحہ پیش آیا تو ان جلیل القدر بزرگان کا سایہ اٹھ جانے کے غم کے ساتھ ساتھ احبابِ جماعت کو ایک فکر یہ بھی دامن گیر تھی کہ ان متذکرہ بالا شخصیات کے حلقہ کے حضرات کا کسی اور کی خطابت وامامت پر اس قدر جلد مطمئن ہونا کیونکر ممکن ہوسکے گا۔ مگر اللہ جل شانہ نے اس مشکل کو مولانا محمد عبداللہؒ کی صورت میں ایک جلیل عالم باعمل دے کر آسان فرما دیا۔ بظاہر یہ ایسا خلا تھا جو جلد پُر ہونے والا نظر نہ آتا تھا۔ مگر حضرت مولانا مرحوم جب جانشین بنے تو سلفی بزرگان کا لگایا ہوا گلشن پہلے کی طرح ہی رونق دینے لگا۔ اللہ تعالیٰ نے خلا کو پُر کرنے کے لئے ایسی شخصیت کا انتخاب کیا جو اس منصب کے لائق اور موزوں ترین شخصیت تھی اور ہر شخص ان کے علم کا دل سے معترف بھی تھا۔

عادات وخصائل

مولانا مرحوم زہد وتقویٰ، تہجد گزاری، دیانتدارانہ اور کریمانہ اخلاق واوصاف کے حامل تھے۔ آپ کی شخصیت میں درج ذیل صفات نمایاں تھیں:

(۱) دیانت وامانت: آپ کی دیانتداری اور امانت داری مسلم تھی۔ لاکھوں روپے پر مشتمل بھاری رقوم کا مکمل حساب کتاب رکھا کرتے تھے۔ اسی وجہ سے جامعہ محمدیہ کا گوشوارہ آمد وخرچ باقاعدہ ہر سال

شائع کیا جاتا ہے کہ کسی کے ذہن میں غلط خیال جنم نہ لینے پائے۔ رسیدوں کو فائلوں میں محفوظ رکھنا، باقاعدہ چیک کرنا، اخراجات پر کڑی نگاہ رکھنا، مشکوک رسید کی بغیر تحقیق کے منظوری نہ دینا، قوم کے صدقات کو ضرورت سے زیادہ یا بلا ضرورت خرچ کرنا، آمدن کو خفیہ رکھنا یا سالانہ حساب وکتاب سے لوگوں کو آگاہ نہ کرنا، مولانا کے نزدیک سخت معیوب تھا۔ اولاً تو مولانا کسی ہاتھ سے کوئی رقم لیتے ہی نہ تھے، بلکہ انجمن کے سفیر کے ذریعہ سے ہی حاصل کرتے، اگر لے بھی لیتے تو بلا تاخیر رسید کاٹ کر واپس فرماتے، یہی وجہ ہے کہ مولانا پر آج تک کسی بڑے سے بڑے مخالف کو یہ جرأت نہیں ہوسکی کہ وہ مولانا مرحوم کی دیانت وامانت پر انگشت نمائی کرسکے۔

(۲) قناعت پسندی: مولانا کی ایک بڑی خوبی ان کی قناعت پسندی ہے۔ جماعت نے جو بھی مشاہرہ ان کے لئے مقرر کیا، اسی پر اکتفا کیا۔ حالات کے مدوجزر کے باوجود کسی سے دست سوال دراز نہیں کیا۔ خطباتِ جمعہ یا دیگر خطبات میں باوجود اصرار کے مولانا نے کبھی معاوضہ نہیں لیا۔ موقع بموقع پیسے لینے کی عادت قناعت پسندی کے خلاف تو ہے ہی، مزید اس سے علما کا وقار اور خودداری متاثر ہوتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ علما کے احترام میں وہ حقیقی جذبہ مفقود ہوتا جارہا ہے جو ہر دور میں ائمہ اسلاف کی علامت رہا ہے۔ قناعت پسندی اور عزتِ نفس کی بقا اسی پر منحصر ہے کہ علما قناعت پسندی اختیار کریں، کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کریں۔

(۳) تحقیق: آپ کی یہ صفت بھی نمایاں تھی کہ آپ ہر معاملہ میں چاہے شرعی ہو یا غیر شرعی، تحقیق کے بغیر کوئی رائے یا نظریہ قائم نہ کرتے تھے۔ یقیناً تحقیق کے بغیر انسان کی عقل اپاہج اور علم اُدھورا نظر آتا ہے۔ جس شخص میں تحقیق کا مادّہ نہ ہو، وہ نہ تو خود علم سے صحیح فائدہ اٹھا سکتا ہے نہ دوسروں کی درست طور پر رہنمائی کرسکتا ہے۔ صحیح فیصلہ کے لئے تحقیق کے راستہ سے گزرنا ضروری ہوتا ہے، اس سے ذہن کو جلا اور دل کو اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ تحقیقی رجحان کا یہ حال تھا کہ عام لڑائی جھگڑے کے فیصلے میں بھی معاملات کی پوری چھان بین کیا کرتے۔ فریقین کے درمیان تنازعہ شدت پکڑ کر ان کے سامنے آتا تو دونوں فریقوں کی گفتگو سنے بغیر کبھی فیصلہ صادر نہ کرتے تھے۔

(۴) قول کے ساتھ عمل بھی: حضرت مولانا مرحوم ان بزرگوں میں سے تھے جو بات کہتے تھے اس پر عمل بھی کرتے تھے یعنی قرآن وسنت کا عملی نمونہ تھے۔ ایسا آج تک دیکھنے میں نہیں آیا کہ ان کا نقطہ نظر تو کوئی اور ہو لیکن عمل اس کے خلاف۔

(۵) جامعہ محمدیہ کی دیکھ بھال اور پیدل سفر کرنا: یہ علالت سے پہلے اس دور کی بات ہے جب شیخ

الحدیث مولانا محمد عبداللہ صاحب جامعہ محمدیہ کے مہتمم ہوا کرتے تھے۔ تب اکثر مولانا جامعہ محمدیہ، نیائیں چوک سے جامعہ محمدیہ جی ٹی روڈ تک پیدل آتے تھے۔ ان کا درمیانی فاصلہ تقریباً ۵ کلومیٹر ہے۔ پھر جامعہ میں آکر جامعہ کے متعلقہ ہر چیز کی دیکھ بھال خود کرنے کی کوشش میں رہتے، وسیع وعریض جامعہ کے اشجار، درودیوار کے متعلق پوری معلومات رکھتے تھے۔

چند روح پرور روشن واقعات

(۱) مولانا مودودیؒ سے مکالمہ: تشکیل پاکستان کے بعد جماعت اسلامی کا پہلا اجتماع گوالمنڈی، ریلوے روڈ لاہور پرواقع 'تسنیم' کے دفتر میں ہوا تھا۔ مختلف اضلاع سے آنے والے وفود کے لئے مولانا مودودیؒ سے ملاقات کا الگ الگ وقت متعین تھا تاکہ ہر ضلع سے آنے والے احباب کے ساتھ تبادلہ خیالات ہوسکیں۔ گوجرانوالہ سے آئے ہوئے وفد میں حضرت مولانا محمد عبداللہ مرحوم بھی شامل تھے۔ نمازِ عشا کے بعد جب ملاقات کا وقت آیا تو گوجرانوالہ کے احباب مولانا کی معیت میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی خدمت میں حاضر ہوئے، کچھ دیر تبادلہ خیالات ہوتا رہا۔ آخر میں مولانا مودودی نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص استفسار کرنا چاہتا ہے تو کرسکتا ہے۔ دیگر بہت سے قومی نوعیت کے سوالات کے دوران مولانا عبداللہ مرحوم نے ایک سوال یہ بھی کیا کہ آپ قرآن وسنت کی طرف لوگوں کو دعوت دیتے ہیں، آپ کا نصب العین ملک میں اسلامی نفاذ ہے اور اسلام قرآن وسنت کا نام ہے اور حدیث میں صحیحین کا مقام سب کے نزدیک مسلم ہے۔ جبکہ رفع الیدین فی الصلوٰۃ کی احادیث صحیحین میں آتی ہیں اور آپ ان پر عمل نہیں کرتے۔ احادیث صحیحین کے ساتھ یہ رویہ مناسب نہیں ہے۔ اس پر مولانا مودودیؒ نے یہ جواب دیا

> ''رفع الیدین سے لوگ متوحش ہوتے اور بدک جاتے ہیں، اس لئے میں عام جگہوں پر جب نماز پڑھتا ہوں تو رفع الیدین نہیں کرتا لیکن جب گھر میں تہجد کی نماز پڑھتا ہوں تو رفع الیدین کرلیتا ہوں۔'' (تذکرہ علمائے اہلحدیث پاکستان: ص۳۸۴)

(۲) مولانا امین احسن اصلاحی سے ایک مکالمہ: ۱۹۴۴ء کی بات ہے کہ تحصیل پٹھان کوٹ ضلع گورداسپور کے ریلوے اسٹیشن 'سرانہ' میں جماعت اسلامی کا سالانہ اجلاس تھا۔ مولانا عبداللہ مرحوم بھی تین چار افراد سمیت سرانہ پہنچ گئے۔ اجلاس میں شامل ہوکر باقاعدہ کارروائی سنتے رہے، وقفہ میں چہل قدمی کے لئے نکل جاتے۔ ایک مرتبہ بعد از نمازِ عصر مولانا باہر سے تشریف لائے تو دیکھا چارپائی پر مولانا امین احسن اصلاحی تشریف فرما ہیں اور قریب کی چارپائیوں پر بیٹھے افراد سے یہ تذکرہ فرما رہے تھے کہ خبر واحد حجت نہیں ہے۔ مولانا عبداللہ مرحوم جب وہاں پہنچے تو اصلاحی صاحب فرمار ہے تھے، میں نے ایک کتاب لکھی ہے جس میں مدلل انداز سے یہ بات ثابت کی گئی ہے کہ خبر واحد حجت نہیں اور اس کتاب کا کوئی

پنجاب میں سکھوں کو شکست دی تو عام مسلمانوں نے سکھ کا سانس لیا۔ پھر ۱۹۴۷ء میں سکھوں کے وحشی جتھوں نے پاکستان آنے والے مہاجرین کے قافلوں کے ساتھ جس غارت گری کا مظاہرہ کیا، اس کو مسلمان کیسے فراموش کر سکتے ہیں۔

پنجابیت کے بے حمیت علمبرداروں کی آنکھ کا پانی خشک نہ ہو چکا ہوتا تو وہ کبھی سکھوں کے ساتھ 'سانجھے کلچر' کو پروان چڑھانے کی بات نہ کرتے۔ پنجاب میں آج بھی لاکھوں گھرانے ایسے ہیں جہاں کوئی نہ کوئی مہاجر اپنے عزیز و اقارب کے قتل ہونے کے واقعات سنانے کے لئے زندہ ہے۔ مشرقی پنجاب میں اب بھی ایسی ہزاروں بے بس اور ستم رسیدہ بوڑھی مسلمان عورتیں زندہ ہوں گی جنہیں ۱۹۴۷ء میں سکھ بدمعاشوں نے اغوا کر کے اپنے گھر میں رکھ لیا تھا۔ حالات کے جبر نے انہیں غیر مسلمانوں کے ساتھ زوجیت کا بے نکاحی رشتہ نبھانے پر مجبور کر دیا۔ نجانے ان میں سے کتنی آج بھی کسی محمد بن قاسم جیسے بھائی، باپ، بھتیجے کے انتظار میں ہوں گی جو اپنے مسلمان ہاتھوں سے انہیں مسلمانوں کے قبرستان میں دفنا سکے۔ ابھی چند سال پہلے اس طرح کی مظلوم عورت کس طرح لاہو رپہنچ گئی تھی مگر تلاشِ بسیار کے باوجود یہ اپنے خاندان کو تلاش نہ کر سکی۔

فخر زماں جو آج پنجاب سے اُردو بولنے والوں کو دھکے دے کر نکال دینے کی بڑھکیں مار رہا ہے، اس میں اسلامی حمیت بلکہ پنجاب کی غیرت ہی ہوتی تو وہ ان بے بس مسلمان عورتوں کا سکھوں سے حساب ضرور مانگتا۔ مگر جب الحادرگ و پے میں سرایت کر جائے تو پھر ایسی حمیت کی توقع رکھنا عبث ہے۔ یہ فخر زماں جیسے بے غیرت اَفراد کا حوصلہ ہے کہ وہ چندی گڑھ میں جا کر ایوارڈ وصول کرتے ہیں اور لاہور میں پنجابی کانفرنس کے پردے میں سکھوں کے ساتھ شراب و کباب کی فاسقانہ محافل برپا کرتے ہیں۔

۳۔ پنجابی زبان و ادب اور پنجابیت کے خانہ زاد علمبردار بے نور دماغ اس قابل بھی نہیں ہیں کہ اپنے نظریات کی تکمیل کے لئے جو تنظیم قائم کرتے ہیں، اس کا نام ہی پنجابی زبان میں رکھ سکیں۔ لاہور میں پنجابی کانفرنس کا اہتمام کرنے والی تنظیم کا نام "ورلڈ پنجابیت فاؤنڈیشن" ہے جس کے ارکان میں 'مہادانشور' قسم کے لوگ شامل ہیں۔ فخر زماں، اس کے نائب صدر ہیں۔ اس تنظیم کے نام میں ورلڈ اور فاؤنڈیشن تو انگریزی کے الفاظ ہیں مگر 'پنجابیت' فارسی یا اُردو سے لیا گیا ہے۔ کیا پنجابی زبان میں اس کا متبادل کوئی لفظ نہیں ہے؟ اگر پہلے سے نہیں ہے تو نیا لفظ بھی ایجاد کیا جا سکتا تھا۔ مگر سطحی ذہن رکھنے والے یہ نعرہ باز قسم کے دانشور اتنا بھی تکلف نہیں کر سکے۔ یہ پنجابی زبان و ادب کی خدمت کیا خاک کریں گے؟؟

۴۔ <u>پنجابی ثقافت اور پنجابی زبان سے منتظمین کا انحراف:</u> پنجابی کانفرنس میں پنجابیت کی بات تو بہت کی گئی، مگر اس اصطلاح کا حقیقی مفہوم واضح کرنے کی زحمت کسی دانشور نے گوارا نہ کی۔ پنجابیت سے مراد اگر پنجابی کلچر ہے، تو اس کا مظاہرہ پنجابی کانفرنس میں دیکھنے میں نہ آیا۔ پنجابیت کے یہ کوتاہ فکر دانش باز شاید کلچر میں زبان ہی کو سب کچھ سمجھتے ہیں۔ کلچر جن متعدد اجزا سے مل کر تشکیل پاتا ہے، ان میں رہن سہن، عادات و اطوار، لباس و پوشاک، طرزِ زندگی، عقائد و ایمان، پسند ناپسند، سماجی رویے، کھانے پینے کے مخصوص طریقے، اندازِ نشست و برخاست، انسانی رویے غرض اس طرح کے بے شمار عناصر ہیں جن کے مجموعہ کو کلچر کا نام دیا جاتا ہے۔ پنجابی کانفرنس میں جو کلچر پیش کیا گیا وہ بدمعاشوں اور اوباشوں کا کلچر تو کہا جا سکتا ہے، پنجاب کے شرفا یا عوام کا کلچر ہرگز نہیں ہے۔

پنجابیت کے بڑے دعویدار فخر زماں نے پنجابی لباس کی بجائے فرنگی لباس ٹی شرٹ کے ساتھ پہنا ہوا تھا۔ کانفرنس میں شریک سکھ شرکا نے سوائے سروں پر پگڑ باندھنے کے باقی تمام انگریزی لباس زیب تن کیا ہوا تھا۔ یہ کون سی پنجابیت ہے جس میں پنجابی لباس کہیں نظر نہیں آتا۔ پھر ذرا غور فرمایئے اہل پنجاب، بالخصوص مسلمان کتنے ہیں جو شراب یوں اجتماعی مجالس میں غٹا غٹ پیتے ہیں۔ کانفرنس کے دوران فلیٹیز ہوٹل میں سکھوں، ہندوؤں، مشرقی پنجاب سے آنے والی بے حیا لڑکیوں اور پاکستان کے پنجابی دانشوروں نے اس قدر شراب چڑھائی کہ اخبارات کے رپورٹرز کے بقول گذشتہ چار ماہ میں شراب کے اس قدر پرمٹ جاری نہیں ہوئے تھے۔ تکبیر کے نمائندے اسرار بخاری کی رپورٹ کے مطابق پیپلز پارٹی کے مقامی راہنما اور شاعر اسلم گورداس پوری شراب کے نشے میں بری طرح دھت تھے اور ان کی غیر شائستہ حرکتوں کا سب ہی نے نوٹس لیا۔ بھارتی شاعر گوربچن سنگھ جب اپنا کلام سنا رہے تھے، سامعین میں موجود سکھوں نے جو بری طرح ٹن تھے، نازیبا حرکتیں شروع کردیں۔ بالآخر گوربچن سنگھ کو آواز دینی پڑی، ''انتظامیہ ایناں نوں نتھ پائے!۔''

بھارت سے آئی ہوئی ڈانسر لڑکیاں مسلسل توجہ کا مرکز بنی رہیں۔ ان لڑکیوں کے کمرے بھی رات گئے تک پررونق رہے۔ (تکبیر، ۲۵ اپریل) یہ بے حیائی اور بدمعاشی کا کلچر آخر پنجاب کا کلچر کیسے ہوگیا؟

۲۰ اپریل کے روزنامہ 'انصاف' میں پنجابی کانفرنس کا اہتمام کرنے والے کرتا دھرتا خواتین و حضرات کی ذاتی زندگیوں کے حوالے سے رپورٹ شائع ہوئی۔ اس رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ پنجابیت کے پرچارک فخر زماں کا بیٹا انگریزی بولتا ہے، گھر میں مغربی فلمیں چلتی ہیں، پنجابی لباس کو حقارت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے...... کانفرنس کی انتظامیہ کمیٹی کے رکن حمید اختر صاحب پنجابی لکھ نہیں سکتے...... طاہرہ مظہر علی کے دونوں بیٹے یورپ میں عیش کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی بیٹی ایک انگریزی اخبار کی ایڈیٹر رہی ہیں۔ ان کا گھرانہ انگریزی صحافت سے ہی وابستہ رہا، گھر میں پنجابی کو کوئی منہ نہیں لگاتا۔

فخر زماں کا ایک بیٹا لاہور گرامر سکول میں زیر تعلیم ہے، گھر میں انگریزی ہی چلتی ہے۔ ان کے گھر کا پورا ماحول مغربی طرز کا ہے...... طاہرہ مظہر علی خان کا گھر مغربی طرز کا ایک شاہکار ہے۔ ان کے گھر میں کوئی ایک شخص بھی پنجابی زبان میں بات نہیں کرسکتا۔ یہ لوگ انگریزی بولنے اور سیکھنے میں ہی فخر محسوس کرتے ہیں۔ یہ لکھتے ہوئے ہمیں شرم محسوس ہوتی ہے کہ کانفرنس میں شریک ہونے والے بھارتی اداکار راج ببر کی بیوی نادرہ کا تعلق 'مسلمان' گھرانے سے ہے۔ یہ پاک و ہند میں ترقی پسند تحریک کے بانی معروف کمیونسٹ راہنما سجاد ظہیر کی صاحبزادی ہیں۔ کیا کوئی پنجاب میں ایسا بے غیرت موجود ہے جو اپنی بیٹی کا 'نکاح' کسی ہندو سے کردے۔ پنجاب کی غیرت مند بیٹیوں نے تو ہندوؤں کے چھونے کی بجائے موت کو ترجیح دی تھی۔ مگر آج پنجابیت کی علمبردار ایک نام نہاد 'مسلمان' عورت ایک ہندو کی بیوی بننے میں کوئی عار محسوس نہیں کرتی۔ پنجاب کے سادہ لوح عوام یہ پوچھنے کا آخر حق تو رکھتے ہیں کہ یہ لوگ جو پنجابیت کے خودساختہ پرچارک بنے ہوئے ہیں، ان کی اپنی زندگیوں میں پنجابیت کس قدر سرایت کئے ہوئے ہے؟ یہ اہل پنجاب اور ان کی ثقافت کا کھلا استحصال ہے۔ روزنامہ انصاف کے اداریہ نویس کی پیش گوئی بالکل درست ہے: ''عوامی ردعمل ان کے خلاف ہوا، تو انہیں پناہ کے لئے لندن یا دلی بھاگنا ہوگا، پنجاب کی سرزمین میں انہیں کوئی جائے پناہ نہیں ملے گی۔'' (۲۵ اپریل)

۵۔ ہندوستان اور پاکستان کی پنجابی میں زمین آسمان کا فرق ہے: یہ ایک فکری مغالطہ ہے کہ پنجاب کے سکھوں، ہندوؤں اور مسلمانوں کی مادری زبان 'پنجابی' ایک ہے۔ مسلمان جو پنجابی بولتے ہیں وہ اس پنجابی سے بہت مختلف ہے جو ہندو یا سکھ بولتے ہیں۔ ایک ہی علاقے کے رہنے والے مسلمان اور سکھوں کا لہجہ شاید ملتا جلتا ہو، مگر ان کا ذخیرۂ الفاظ ایک نہیں ہے۔ مسلمانوں کی پنجابی پر عربی، فارسی ادب اور اسلامی تعلیمات کا گہرا اثر ہے۔ سکھوں اور ہندوؤں کی پنجابی پر ہندی زبان اور سنسکرت کے الفاظ کا اثر اس قدر زیادہ ہے کہ ایک ہندو ادیب کی پنجابی تحریر بعض اوقات ایک مسلمان کے لئے سمجھنا بے حد دشوار ہوجاتا ہے۔ یہ موضوع بے حد تفصیلی تنقید و تحقیق کا متقاضی ہے۔ مگر راقم یہاں اختصار کے ساتھ اس بنیادی فرق کو واضح کرنے میں دلچسپی رکھتا ہے۔ راقم کے سامنے اس وقت امرتسر سے نکلنے والا معروف پنجابی زبان کا رسالہ 'اجو کے شیلا لیکھ' کا اپریل ۲۰۰۱ء کا شمارہ ہے۔ اس کے ایڈیٹر ایچ۔ ایس بھٹی ہیں جو ورلڈ پنجابیت فاؤنڈیشن کے چیف ایگزیکٹو آفیسر ہیں۔ کھوجی کافر جو اس فاؤنڈیشن کے جوائنٹ سیکرٹری ہیں، اس رسالہ کے بورڈ کے ممبر ہیں۔ یہ رسالہ عالمی پنجابی کانفرنس کے دوران تقسیم کیا گیا۔ اس رسالہ میں شامل مضامین سے منتخب کئے گئے چند فقرے ملاحظہ کیجئے:

۱۔ اس سماگم دا سنچالن سماوک پنجابی ٹریبون نے کیتا، اس دی پردھانگی شری ہربھجن ہواروی نے کیتی۔ ص ۵

۲۔ اس توں بلا سماں سماروح شروع ہویا۔ (صفحہ نمبر ۵)

۳۔ اتے پاکستان وچ پنجابی ضبان اتے سبھیاچار دی ستھتی نے چانناں پایا۔ (صفحہ ۷)

۴۔ پنجابی بدھی جیویاں نے آپنے خیالی پرگٹ کیتے۔ (صفحہ نمبر ۷)

۵۔ پنجابیاں دے لگاتار استھر اتہاس نے اتے جھوجھن دے سوبھاونے نے ایہنانوں شکتی شالی طاقت بخشی، اونوں دیش دی گھڑگ بھوجا بنا دتا۔ (صفحہ نمبر ۹)

مندرجہ بالا فقروں میں استعمال کئے گئے الفاظ ''سماگم، سنچالن، سماوک، پردھانگی، سنمان، سماروح، سبھیا، ستھتی، بدھی جیویاں، پرگٹ، جھوجھن، شکتی شالی، گھڑگ، استھر اتہاس وغیرہ لاہور میں بسنے والا شاید ہی کوئی مسلمان پنجابی سمجھتا ہو۔ مذکورہ رسالہ کا نام بھی پاکستانی پنجاب کے لوگوں کی سمجھ میں آنے والا نہیں ہے۔ اس رسالے کے پہلے صفحے پر سرپرستوں اور مدیروں کے نام دیئے گئے ہیں۔ جس میں ایچ ایس بھٹی کو 'مکھ پر بندھک' اور کھوجی کافر کو 'پر بندھی سماوک' لکھا گیا ہے، نجانے ان الفاظ کا مطلب سرپرستِ اعلیٰ یا مدیر ہے یا کچھ اور۔ اس رسالہ پر ناشر کے لئے 'پرکاشک' کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔

مجھے معلوم نہیں ہے کہ پاکستانی پنجاب میں شائع ہونے والے کسی پنجابی زبان کے رسالہ کے شروع میں اس طرح کے الفاظ کبھی استعمال کئے گئے ہیں۔ میرے سامنے اس وقت لاہور سے شائع ہونے والے رسالہ 'پنجابی' کے چند شمارے رکھے ہیں۔ اس کے سرورق پر لکھا ہے: 'ایڈیٹر: محمد جنید اکرم' اس رسالہ کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ قیامِ پاکستان کے بعد پنجابی زبان میں چھپنے والا یہ پہلا رسالہ ہے۔ ایڈیٹر کے لفظ کے علاوہ، سرپرست، نگران، نگرانِ اشاعت، ایگزیکٹو ایڈیٹر، اور مینیجنگ ایڈیٹر جیسے الفاظ، عہدے اور نام بھی اس پر شائع شدہ ہیں۔ ان دو رسالوں میں دی گئی فہرست عہدیداران سے ہی مغربی اور مشرقی پنجاب میں بولی اور لکھی جانے والی پنجابی کا فرق بخوبی سمجھا جاسکتا ہے۔ یہ تو بات وضاحت کی محتاج نہیں کہ سکھ گورمکھی رسم الخط میں پنجابی لکھتے ہیں جبکہ مسلمان شاہ مکھی میں جو درحقیقت فارسی رسم الخط ہے۔ پاکستانی پنجاب میں کتنے لوگ ہیں جو گورمکھی کو پڑھ اور لکھ سکتے ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں کی پنجابی غیر مسلموں کی پنجابی سے اتنی ہی مختلف ہے جتنی کہ ہندی اُردو سے

مختلف ہے۔ ڈاکٹر سید اختر جعفری پنجابی زبان کے معروف مصنف اور نقاد ہیں۔ ان کی کتاب 'نویں زاویئے'، پنجابی ادبی تنقید کے حوالے سے مقبولیت حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ صدارتی ادبی ایوارڈ بھی حاصل کرچکی ہے۔ یہ کتاب سی ایس ایس کے پنجابی کے پرچے میں بھی شامل ہے۔ اس کتاب میں وہ لکھتے ہیں:

> ''لسانی اعتبار سے پنجابی زبان اور ادب کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں کے داخل ہونے کے ساتھ ہی پنجابی نے اپنے آپ کو بھرنش (زبان) سے جدا کرکے اپنا بالکل وکھرا، منفرد اور قابل پہچان روپ اختیار کرلیا۔ یعنی پنجابی بولی کا پراکرت اور بھرنش زبان سے رشتہ (سانجھ) ٹوٹ گیا۔ اس وقت صوفیاے کرام نے پنجاب میں اسلام کی تبلیغ کا آغاز کیا، ان کی کوششوں سے قرآن پاک کی تعلیم عام ہوئی۔ اسلامی تصوف کی ٹھنڈی چھائیں ہندوستان کی زمین پر پھیل گئیں۔ جس کے نتیجے میں عربی اور فارسی کے ان گنت الفاظ خود بخود وقفکے ساتھ پنجابی زبان میں داخل ہوگئے۔ ان میں سے بہت سارے ایسے الفاظ تھے جو پہلے پنجابی میں موجود نہیں تھے۔'' (نویں زاویے: صفحہ ۴۶۶)

پنجابی زبان کے مستند محقق تو کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی پنجابی زبان کا پراکرت اور بھرنش سے اس وقت ہی سانجھ ٹوٹ گیا تھا جب اسلام پنجاب میں داخل ہوا، نجانے فخر زماں سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان کس لسانی اشتراک کی بنیاد پر 'سانجھے کلچر' کو پروان چڑھانے کی واہیات جدوجہد کر رہے ہیں۔

۶۔ زبان اور مذہب کا اٹوٹ رشتہ: ہمارے سیکولر دانشور جس قدر جی چاہے مذہب کے خلاف اپنے خبث باطن اور بیزاری کا اظہار کرتے پھریں مگر یہ ایک یونیورسل (آفاقی) حقیقت ہے کہ کرۂ ارضی کی معروف اور بڑی زبانوں کے ارتقا اور ترقی میں مذہب اور مذہبی تعلیمات نے بے حد اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ بعض خطے کے رہنے والوں نے نہایت خوش دلی کے ساتھ اپنی مادری زبان کو چھوڑ کر ایک ایسی زبان کو اپنا لیا جس میں ان کی مذہبی تعلیمات کا ذخیرہ موجود تھا۔ پھر ایک وقت آیا کہ وہ مذہبی زبان ہی ان کی مادری زبان کا روپ دھار گئی۔ مصر، تیونس، لیبیا، مراکش، الجزائر، سوڈان جیسے ممالک کے لوگ آج عربی زبان بولتے ہیں، مسلمانوں کی آمد سے پہلے ان علاقوں کی الگ الگ زبانیں موجود تھیں۔ مگر ان لوگوں نے عربی زبان کو اس قدر والہانہ پذیرائی بخشی کہ ان کی قدیم مادری زبانیں اب صرف تاریخ کے صفحات پر ہی موجود ہیں۔ اس تبدیلی کی بنیادی وجہ یہ نہیں تھی کہ ان خطوں کی زبانیں عربی کے مقابلے میں کم ترقی یافتہ تھیں۔ زبان ترقی یافتہ ہو یا غیر ترقی یافتہ، اس کے بولنے والے اس کے متعلق لسانی عصبیت ضرور رکھتے ہیں۔ زور اور جبر سے اس کا خاتمہ نہیں کیا جاسکتا۔ عربی زبان کو اپنا لینے کی اصل وجہ یہ تھی کہ یہ زبان وہ ہے جس میں قرآن مجید اُترا اور یہ زبان مسلمانوں کے آقاے نامدار حضرت محمد ﷺ کی زبان ہے۔ اس زبان سے مسلمانوں کی دلچسپی محض ادبی اعتبار سے نہیں، اس سے عقیدت کی حقیقی وجہ اس کا اسلام سے تعلق ہے۔

مندرجہ بالا علاقوں کے علاوہ ایران، فارس کے بہت سے علاقوں میں بھی مسلمانوں نے فارسی کی بجائے عربی زبان کو اپنا لیا۔ اس زمانے کے معروف عجمی سائنس دانوں، علما اور صوفیاے کرام نے عربی زبان میں تصانیف تحریر کیں۔ سنسکرت اور ہندی سے ہندوؤں کی دلچسپی محض لسانی اور علاقائی عصبیت کی بنیاد پر نہیں ہے۔ وہ ان زبانوں سے والہانہ شغف رکھتے ہیں کیونکہ انہی زبانوں میں ان کا مذہبی لٹریچر موجود ہے۔ آج بھارت میں اردو، فارسی اور عربی زبان کو جو دیس نکالا دیا جارہا ہے، اس کے محرکات بھی مذہبی ہی ہیں۔

لکھویؒ، مولانا معین الدین لکھوی، حافظ عبدالمنان نور پوری، پروفیسر ڈاکٹر فضل الٰہی جیسی فاضل شخصیات فارغ التحصیل ہیں۔

مولانا کی خدمات کا جائزہ لیا جائے تو یہ نصف صدی تک پھیلا ہوا نظر آتا ہے کوئی دو چار برس کی بات نہیں ہے۔ ۱۹۳۲ء کے قرب و جوار کا وقت تھا جب علم تجوید وقراءت کو سلفی العقیدہ حضرات اس قدر اہمیت نہیں دیتے تھے۔ تب حضرت مولانا داؤد غزنویؒ نے لاہور کی مسجد چینیانوالی میں علم تجوید وقراءت کا پودا کاشت کیا تو گوجرانوالہ میں حضرت مولانا اسماعیل سلفیؒ نے جامعہ محمدیہ چوک اہلحدیث میں علم تجوید وقراءت کی تعلیم اور ذوق عام کرنے کے لئے ایک شعبہ قائم کیا۔ جس کی عرصہ ۲۷، ۲۸ سال تک مولانا مرحوم نے بڑی بڑی مشقتیں برداشت کرکے آبیاری اور پرورش کی اور شعبہ پر آنچ نہ آنے دی۔ آج علومِ قرآن سے فیض یافتہ قراء حضرات کے پیچھے حضرت مولانا مرحوم کی انتھک محنتوں کا ہاتھ ہے۔ حضرت مولانا جب سخت علیل ہوئے تو اس شعبہ کی ذمہ داری مولانا حافظ محمد امین محمدی صاحب کے سر آن پڑی، جو اپنی بلند ہمتی کی بنا پر اس شعبہ کو عام کرنے کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔ مولانا امین محمدی صاحب جامعہ اسلامیہ نصر العلوم عالم چوک گوجرانوالہ کے بانی ہیں۔

سفرِ آخرت

مولانا عبداللہ مرحوم صاحب اپنے بڑے بیٹے عبدالرحمٰن کی اچانک وفات کے بعد مسلسل نحیف ہوتے چلے گئے۔ اوپر سے بڑھاپے نے اثرات دکھانا شروع کردیئے۔ بالآخر ۲۸/ اپریل ۲۰۰۱ء کو صبح چھ بجے علامہ اقبال میموریل ہسپتال، گوجرانوالہ میں اپنے خالق حقیقی سے جاملے۔ ان کی نماز جنازہ سہ پہر ساڑھے پانچ بجے شیرانوالہ باغ میں پڑھی گئی جو گوجرانوالہ شہر کی تاریخی نماز جنازہ تھی۔ جس میں بلا امتیاز ہر مکتبِ فکر کی مذہبی، سیاسی اور سماجی شخصیات نے شرکت کی ...... اللهم اغفرله وارحمه!

چمن علماء (جامعہ محمدیہ) سے شیرانوالہ باغ تک

مولانا مرحوم کے وفات کی خبر جیسے جیسے پھیلتی گئی۔ عورتوں و مردوں کا ہجوم مولانا کے گھر اور جامعہ محمدیہ میں بڑھتا گیا۔ ۱۲ بجے کی خبروں میں مولانا کی خبر وفات نشر کردی گئی تھی، اس خبر کا نشر ہونا تھا کہ لوگ دوسرے شہروں سے گوجرانوالہ پہنچنا شروع ہوگئے۔ انتظام کرنے والے احباب نے جنازہ کے لئے شیرانوالہ باغ کا چناؤ کیا اور ساڑھے پانچ بجے کا وقت مقرر ہوا۔ حسب پروگرام گھر سے بعد از غسل و تکفین جسد خاکی کو جامعہ محمدیہ چمن علماء میں لایا گیا، جہاں میت کو کچھ وقت کے لئے دیدارِ عام کے لئے رکھا گیا۔ علماء طلباء جامعہ اور دیگر حضرات دھاڑیں مار مار کر رو رہے تھے کہ وہ عبداللہ جس نے اس چمن کی خون پسینہ

سے آبیاری کی تھی، آج اسی چمن سے اپنا سایۂ شفقت اٹھائے چل دیئے ہیں۔

دوسری طرف شیرانوالہ باغ میں لوگ دیدار اور شرکتِ جنازہ کے لئے دو بجے سے ہی پہنچنا شروع ہوگئے تھے، باغ کی طرف نکلنے والا ہر راستہ لوگوں سے بھرا ہوا نظر آتا تھا۔ ساڑھے چار بجے کے قریب کا وقت ہوگا کہ مولانا کی میت کو باغ میں لے جایا گیا، اس وقت باغ کے جس طرف بھی نظر اٹھائیں، اِنسانی سروں کی ایک فصل نظر آتی تھی۔ باغ میں اتنا رش تھا کہ باغ اپنی تنگیٔ داماں کو نہ چھپا سکا۔ نمازِ جنازہ کے لئے صفوں کی درستگی بمشکل عمل میں آئی۔ اس کے بعد مولانا محمد اعظم صاحب نے شیخ الحدیث مرحوم کے متعلق پانچ منٹ کی گفتگو فرمائی، اس کے بعد پروفیسر ساجد میر، امیر مرکزی جمعیت اہلحدیث نے حضرت مرحوم کی فضیلت اور جماعتی خدمات پر جامع تقریر کے بعد نمازِ جنازہ پڑھائی۔

آخری دیدار کرنے والے لوگ انتظامیہ کو ہر اعتبار سے بے بس کر چکے تو میت کو نقصان پہنچ جانے کے خوف سے اُٹھا لیا گیا۔ بنابریں بہت سے عقیدت مند آخری دیدار نہ کرسکے۔ میت کی چارپائی کو لمبے بانسوں کے ساتھ باندھا گیا تھا، قبرستان میں میت پہنچی ہی تھی کہ لوگوں کا جم غفیر قبر کی طرف کچھ اس انداز سے اُمڈ آیا کہ چارپائی رکھنے کے لئے بھی جگہ نہ بچی۔ بالآخر چاروناچار میت کو لوگوں کے سروں کے اوپر سے گزار کر قبر تک پہنچایا گیا۔

لاہور اور ملک بھر سے بہت سے علما آپ کے جنازے میں شرکت کے لئے حاضر ہوئے۔ ادارۂ محدث سے مدیر اعلیٰ حافظ عبد الرحمن مدنی، کلیہ الشریعہ کے پرنسپل مولانا شفیق مدنی، شیخ التفسیر مولانا عبدالسلام ملتانی اور ناظم جامعہ محمد یوسف صاحب نے بھی جنازہ میں شرکت کی اور رات گئے واپسی ہوئی۔

تدفین: حضرت شیخ الحدیث صاحب مرحوم کی قبر گوجرانوالہ کے قبرستان کلاں میں حضرت مولانا علاؤ الدین ؒ اور مولانا محمد اسماعیل سلفی ؒ کے پہلو میں اور حضرت حافظ محمد گوندلوی ؒ کی قبر کے قریب تیار کی گئی تھی، بعد از نمازِ مغرب میت کو لحد میں اتارا گیا، تدفین مکمل ہونے کے بعد حضرت مولانا محمد رفیق سلفی صاحب نے قبر پر رقت آمیز دعا مانگی۔ زندگی بھر مولانا محمد اسماعیل سلفی ؒ کی جانشینی کا حق ادا کر دینے والا جانشین اس شہر خموشاں میں بھی اپنے قائد مولانا اسماعیل سلفی ؒ کے پہلو میں جا سویا۔ (انا للہ وانا الیہ راجعون)

شاید انہی کے لئے شاعر نے کہا تھا:

فما كان قيس هلكه هلك واحد   ولكنه بنيان قوم تهدما
إلى الله أشكو لا إلى الناس أنني   أرى الارض تبقى والأخلاء تذهب
أخلاء! لو غير الحمام أصابكم   عقبت ولكن ما على الموت معبث

"قیس کی موت تنہا آدمی کی موت نہیں، اس کے مرنے سے تو پوری قوم کی عمارت گر پڑی ہے۔
میرا شکوہ اللہ سے ہے، لوگوں سے نہیں۔ میں دیکھتا ہوں کہ زمین کی آبادیاں جوں کی توں قائم ہیں اور دوست ہیں کہ چلے جارہے ہیں۔ دوستو! موت کے سوا کوئی اور مصیبت ہوتی تو اس کا گلہ کیا

جاتا، لیکن میرے سے موت پر کیسا گلہ!''

تلامذہ: محترم مولانا عبداللہ مرحوم کے تلامذہ کا شمار تو بہت مشکل ہے، البتہ چند نامور تلامذہ کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں:

۱۔ مولانا شمشاد احمد سلفی (نارنگ منڈی)
۲۔ مولانا عبدالغفور (جہلم)
۳۔ مولانا حافظ عبدالمنان نورپوری
۴۔ مولانا پروفیسر قاضی مقبول احمد
۵۔ مولانا بشیر الرحمن (گوجوانوالہ)
۶۔ مولانا عبدالرحمن الواصل (گوجرانوالہ)
۷۔ مولانا یوسف ضیاء (قلعہ دیدار سنگھ)
۸۔ مولانا عبدالقیوم (نارووال)
۹۔ مولانا محمد علی جانباز (سیالکوٹ)
۱۰۔ مولانا عبدالسلام بھٹوی
۱۱۔ شیخ عبدالرحیم صاحب (سیالکوٹی)
۱۲۔ مولانا محمد عبداللہؒ (گجرات)

سوگواران: مولانا کے سوگوران بیٹوں میں سے حافظ عمران عریف صاحب جو اس وقت مرکزی جمیعت اہلحدیث گوجرانوالہ کے ناظم ہیں، جامعہ محمدیہ کی انتظامی ذمہ داری بھی اٹھائے ہوئے ہیں، ان کے علاوہ مجیب الرحمن اور محمد نعمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں اور اساتذہ وطلباء جامعہ محمدیہ کے علاوہ احباب جماعت کو صبر جمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین!

تعلیم و تزکیے کا علم اُٹھائے، اِبلاغ دین کے لیے جادۂ پیما

دعوۃ الحق

کسی بھی وقت کسی بھی جگہ ماہنامہ 'دعوۃ الحق' کے ساتھ انٹرنیٹ پر ملاحظہ فرمایئے
ملک میں شائع ہونے والے تمام دینی جرائد کا موضوع وار انڈیکس

...... 'مندرجاتِ حاضرہ' ......

http://dawatulhaq.tripod.com

مسلسل تین ماہ تک نمونے کے شمارے بلا قیمت حاصل کرنے کے لیے ہمیں مطلع فرمائیں

دفتر: ماہنامہ دعوۃ الحق، ۸ گلشن ویو، گلشن اقبال ۱۳ ار سی، کراچی، ۷۵۳۰۰